اُس کے سفید پَروں تلے ریت تھی؛

سفید پَر جو ایک دوسرے کے ساتھ کہیں چُھو جاتے تو اُن میں سے چنگاریاں پھوٹنے لگتیں کہ اُن میں نَمی کا ایک قطرہ نہ تھا۔ خُون صرف دل کے اردگرد گھومتا تھا پَروں میں سُوکھ چکا تھا، اِن میں دوڑنے والی سُرخ نَمی خشک ہو چکی تھی۔ اُس زبان کی طرح جو اُس کے تالُو سے ایک مُردہ سانپ کی مانند چپکی ہوئی تھی۔ جسم زندہ تھا، اِسی لئے اُڑان میں تھا، اُڑان کر رہا تھا پر اُس کا رُواں رُواں چڑیا کے ترہیائے ہوئے بَوٹوں کی طرح مُنہ کھولے ہانپتا تھا اور ہانپے چلا جاتا تھا۔ پرندے کی آنکھوں میں البتہ توانائی تھی مگر ڈوبتی ہوئی۔ اور اُس کے پنجے نیچے سے اُٹھتی ہوئی گرم لُو میں جُھلس رہے تھے، اُس نے اُنہیں سمیٹ کر بدن کے ساتھ لگانے کی کوشش کی لیکن بدن بھی آگ تھا کہ اِسے بجھانے کے لئے کہیں نَمی کا کوئی سانس نہ تھا، اُس نے پھر اُنہیں ڈھیل دے کر لٹکا لیا۔

اُس کے سفید پَروں تلے ریت تھی اور وہ اُڑان میں تھا۔

سفید پَر جو اب شائد سفید نہ تھے، بُھورے ہو رہے تھے، اُن میں جذب ہوتی ہوئی حِدّت اُن کا رنگ بدل رہی تھی، جیسے گرم توَے پر بکھرا سفید آٹا بُھورا ہونے لگتا ہے۔ گوشت کو اپنے ہی پروں کی تپش بے جان کئے دیتی تھی اور ریت کے ذرّوں میں سُلگتی تپش اُس کے پَروں کی جانب لپکتی تھی اور اُن میں چھید کرتی تھی۔ اِس لپک میں ایک کشش تھی، ایک سندیسہ تھا، ایک بلاوا تھا کہ اُڑان ختم ہو جائے، یہ بھٹک جانے کا سفر اختتام تک پہنچے، اِن پروں میں سکت نہ رہے ساکت ہو جائیں، اِنہیں سمیٹ لیا جائے اور یہیں اِس ریت میں اُتارا جائے۔ تو پھر کیسا لگے؟ پروں کی یہ مُٹھی ایک واورولے کی طرح گھومتی اور بے بس آسمان سے گرتی جائے اور نیچے ریت کی تپتی قبر میں گم ہو جائے۔

پرندے کی سُکڑتی آنکھوں نے نیچے دیکھا۔

اُس کی آنکھوں میں لُوگھومتی تھی اور اُنہیں سُکھاتی تھی پھر بھی وُہ نیچے دیکھتی تھیں۔
ریت کے بے انت ذرّے لشکتے تھے، لشکتے تھے اور اُس کی آنکھوں میں پُھوٹتے تھے۔ گرمی کا الاؤ بل کھاتے سانپوں کی صُورت صرف اُس کے ایک بدن کی طرف شُوکتا چلا آرہا تھا۔ گرم لہریں ایک نشہ آور تواتر کے ساتھ اپنے پھڑپھڑاتے لبادے پھیلائے اوپر اُٹھتی تھیں اور اُسے اپنی لپیٹ میں لیتی تھیں۔ اُس کی چونچ کُھل گئی۔ پگھلتی ہوا اُس میں داخل ہوئی اور اُس کے تن کو تندور میں بدل دیا۔ اُس نے چونچ پھر بند کرنے کی کوشش کی، لیکن زبان سُوکھتی تھی، پُھول رہی تھی، ایک قطرہ ... نمی کا ایک سانس۔ گرم فضا میں ریت کی خاموشی میں اُس کے چٹختے پَروں کی شُوکر بھی پیاسی سُولوں کی طرح اُسی کا جسم چھلنی کر رہی تھی، اُس نے سکڑتی آنکھوں کو میچ کر دیکھا، آگے کیا ہے؟ کہاں تک؟ کب تک؟ کیا اس ہوا کو مُجھ سے سوا آج تک کسی اور پرندے کے پروں نے چیرا یا میں پہلا ہوں۔ اور آخری ہوں اور میں کون ہوں اور آگے کیا ہے؟ حلق میں اگر کہیں کچھ ہے، اور اُس تھُوک کو نگلنا کتنا گیلا اور زندہ کر دینے والا لگے گا۔ اُس نے حلق کو پچکایا کہ نمی کا کوئی شائبہ اُس میں سے پُھوٹے مگر وہ بھی بنجر اور جُھلسا ہوا کھیت تھا۔ وہاں بھی صرف لُو تھی اور ریت تھی جس کے ذرّے اِس بلندی پر بھی فضا میں حِدّت بکھیرتے تیر رہے تھے۔ اُس نے اِس چھالے ڈال دینے والی لُو کو نگلا اور ریت کو نگلا اور ... .

اور اِن سُوکھے ہوئے پَروں اور خشک جُھلسے ہوئے بے جان ہوتے ڈھیلے پڑتے گوشت کو اُڑان میں رکھنے سے فائدہ؟۔ مُجھے آخر کار ڈار سے الگ ہونے کی سزا بھگتنا ہے، اِن پروں کو یکدم ساکت ہو کر نیچے جانا ہے۔ پانی کی بجائے چمکتی آبلہ ریت کے اتھاہ سمندر میں ۔۔۔۔ اُس نے پھر نیچے دیکھا، خشک اور ڈوبتی آنکھوں کے سامنے بے انت ذرّے چمکے، اور پھر اُسے ہر ہر ذرّے میں اپنی شکل اور اپنا مہاندرہ دکھائی دینے لگا۔ وہاں اتنے پرندے تھے جتنے پرندے آج تک پیدا ہوئے، جو ہیں وُہ بھی، جو نہیں ہیں وُہ بھی اور جو ہوں گے وُہ بھی۔ سب اُس کے ہم شکل، اُس جیسے، اُس کی اُڈیک میں... ہمارے پاس اُتر آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سراب تو نہیں، یہ سراب تو نہیں، اُس نے ہر پرندے سے باری باری پُوچھا اور ہر پرندے نے یہی کہا کہ اس کا جواب تمہارے پاس ہے، اس کا جواب تمہارے پاس ہے، سو اُس نے اپنے پروں کو حرکت میں رکھا کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ وُہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اور اِس زندگی کی بُھوک میں اُس نے ایک طویل سانس اپنی چونچ اور سُوکھی زبان کے درمیان میں سے کھینچا... گرم ہوا کا بھبھو کا اُس کی چونچ کو بُھر بھرا کرتے ہوئے مُنہ میں داخل ہوا اور سُوکھتی زبان کو

پچھولتا حلق میں گیا اور ناگ پھنی کی فصل بوتا، شریانوں اور رگوں میں بیول بن کر چُبھتا اٹکتا اُس کے پورے بدن میں جڑیں پکڑ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُڑان ایک خواب ہے، اور اسی لئے حرکت مدھم پڑتی جا رہی ہے، میں اتنی آہستگی سے اُڑان میں ہوں کہ ہوا میں اُٹھتے اور گرتے

میرے بازوؤں کا ایک ایک پَر گِنا جا سکتا ہے، نیچے پھیلی ہوئی ریت ایک تپتا ہوا بیولیٰ ہے جو اصل نہیں، میرا وہم ہے، میں دراصل جھیل کالری کی سطح پر پانی کو اپنے پروں سے ان گنت چھینٹوں میں تبدیل کرتا اُڑ رہا ہوں اور میری پُونچھ پانی کی ٹھنڈک میں تیر رہی ہے، میرے پروں میں نمی سرائت کرتی ہے، جذب ہو رہی ہے، میرا تن تندور نہیں ٹھنڈا ٹھار ہے۔ میرے منہ میں پانی کا رِم جھم سواد برس رہا ہے، میں آزاد ہوں، میرے گرد بے انت اور اَن گنت پرندوں کا ہجوم ہے۔ میں اکیلا نہیں۔ وہ سب کے سب مجھے دیکھ کر پھڑپھڑا رہے ہیں، خوشی سے چلّا رہے ہیں، پروں سے چھینٹے اُڑا رہے ہیں اور یوں ایک جھیل ہے اور اُس کے اوپر پرندے ہیں اور اُن کے اوپر چھینٹوں کی ایک جھیل ہے جو پرندوں پر برس رہی ہے۔ ہم سب برفانی تودوں اور سرد کاٹتی ہواؤں کی ٹھنڈک لئے ادھر اِن نرم رُتوں کے ملک میں آتے ہیں اور ہر برس آتے ہیں۔ اور میرے آگے پانی میں ایک پرندہ چھینٹے اُڑاتا پھڑپھڑاتا، خوشی سے چیختا جا رہا ہے اور میں اُس کے پیچھے جا رہا ہوں اور میری پُونچھ پانی کی ٹھنڈک میں تیر رہی ہے ... پانی کی ٹھنڈک میں یا لُو کے جُھلسا دینے والے الاؤ میں وہ بُھوری ہو رہی ہے۔ میں اتنی آہستگی سے اُڑان میں ہوں کہ ہوا میں اٹھتے اور گرتے میرے بازوؤں کا ایک ایک پَر گِنا جا سکتا ہے اور وُہ چھینٹے خواب تھے یہ اُڑان تو ہے۔ اُس نے اپنا چھوٹا سا سر جھٹکا، وُہی اُڑان ہے اور نیچے دُور نیچے ریت لشکتی تھی اور لشکتی تھی۔

پھر کڑکڑاتے، ٹوٹنے کے قریب پَروں کے سِرے پر لُو کے ایک تھپیڑے کا لمس چُھوا۔ اِس سے پہلے کی جھلسا دینے والی ہواؤں کی طرح۔ یہ واہمہ تھا کہ اس تھپیڑے میں نمی کا ایک ہلکا سا لمس تھا۔ ذرّہ بھر۔ ایک شائبہ، نمی کا ایک نامعلوم چُوما۔

نیچے ایک لکیر نظر آئی۔

اُس کی سُکڑتی آنکھوں نے پہچان کی۔ لکیر لشکتی تھی پر ریت نہ تھی۔ اُس میں نمی کی جھلک تھی۔ پرندے نے ڈھلکتی گردن سیدھی کی اور پَروں کو اُس لکیر کی سمت دھکیلنے لگا۔ دھیرے دھیرے وُہ قریب ہوا۔ نمی کی لکیر بڑی ہونے لگی، اور اُس کے کنارے کوئی بستی تھی اور اُس سے پرے ہریاول کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے جن کی باس اُس کی مردہ ہوتی ناک میں بھی اُترتی چلی

گئی۔ لکیر کا پاٹ پھیلنے لگا اور لشک کا رقبہ بڑھتا گیا اور پھر اُس نے دیکھا کہ وہاں پانی ہے۔ اور جب اُس کے نیم مُردہ سَر کو، اُس کے سُوکھتے بدن اور مُرجھائے ہوئے پروں کو خبر ہو گئی کہ وہاں پانی ہے تو اُسی لمحے، اُس کی اُڑان کا رُخ اپنے آپ بدل گیا۔ وُہ اُس کی طرف لپکنے کی بجائے اُس نمی سے، اُس پانی سے دُور ہٹتا چلا گیا۔ اُس نے کوشش کی اپنا رُخ سیدھا رکھنے کے لئے لیکن وُہ بائیں جانب جُھکتا گیا۔ پانی سے پرے ہوتا گیا اور اُس کے اپنے پَر اُس کے بس میں نہ تھے، اُس کے اختیار سے باہر تھے۔ اُس کی خواہش الگ تھی اور اُس کی اُڑان کا راستہ اُس سے جُدا تھا۔ وہ گردن کو بَل دے کر اُس جانب دیکھنا چاہتا تھا جس طرف اُس کی خواہش تھی مگر اُس کے پَر اور اُس کا جسم اور اُس جسم میں حرکت کرتی ہوئی کوئی نامعلوم شے اُسے کسی اور راستے کی طرف اڑائے چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے پروں کے بغیر ہی اڑان کر رہا تھا، خود بخود، نہ چاہتے ہوئے بھی، وُہ اُس نمی سے دُور ہو رہا تھا۔ اُس کے نیچے ہریاول کی باس گزر رہی تھی۔ نم آلود مٹّی کی مہک اُس کے نتھنوں میں آتی تھی مگر وہ رُک نہیں سکتا تھا۔ وہ لکیر جو لشکتی تھی اور پانی تھی دھیرے دھیرے اوجھل ہو گئی۔ تب ایک اور تبدیلی اُس کے بدن میں آئی، جس سمت میں وہ اڑان کر رہا تھا اب وہی اُس کی خواہش تھی، وُہ ادھر ہی جانا چاہتا تھا، وُہی اُس کی امنگ تھی اور جیسے وہ اپنے آلنے کو لوٹتا تھا ویسے وہ پوری توانائی سے اُس کشش کے آگے جھکتا نیچے ہوتا چلا گیا۔ نیچے ہریاول سے نچڑتے ہوئے گھنے رُکھ تھے جو اُس کے پاس آ رہے تھے۔ وہ اور نیچے ہوا تو رُکھوں کے ذخیرے میں گھری ایک جھیل دکھائی دی پر اس کا پانی لشکتا نہ تھا۔ پر یہ پانی تو تھا، اُس نے پَیر سمیٹے اور پھڑپھڑاتا ہوا نیچے اُترنے لگا۔ اُس کے جُھلستے بُھورے پَر، تالُو سے چپکی زبان، بُھربھری چونچ اور چنگاریوں سے بویا ہوا بدن پانی پانی لپکنے لگا اور پھر اُس نے دیکھا، اپنی سُوکھتی ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا کہ پانی کے ہر قطرے میں اُس کی اپنی شکل ہے، وہاں بے انت اور ان گنت پرندے تھے۔ وہاں اتنے پرندے تھے جتنے پرندے آج تک پیدا ہوئے، جو ہیں وہ بھی، جو نہیں ہیں وہ بھی اور جو ہوں گے وہ بھی۔ سب اُس کے ہم شکل، اُس جیسے، اُس کی اُڈیک میں۔ ہمارے پاس اُتر آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سراب تو نہیں، یہ سراب تو نہیں، اُس نے ہر پرندے سے باری باری پُوچھا۔ اور کسی نے بھی جواب نہ دیا کیونکہ۔۔۔۔۔ یہ سراب نہ تھا۔ وہ جھیل کنارے پرندوں کے ایک غول کے درمیان میں آگرا۔

پاروشنی نے اُسے ایک ہاتھ سے اٹھایا اور دوسرے سے اُس کی کُھلی چونچ میں پانی ٹپکاتے ہوئے کہا "تم بھی اس جھیل پر مرنے کے لئے آ گئے ہو؟"

پرندے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مر چکا تھا۔

"می آؤں۔ می آؤں" رُکھوں کے اندر سے کہیں مور بولا۔

اُس نے اپنے ہاتھ میں لٹکی پَروں کی پوٹلی کو اُن بے شمار پرندوں کے ڈھیر پر رکھ دیا جو اب ہڈیاں ہو چکے تھے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"گئے برسوں میں پانی یہاں تک آتے تھے" اُس نے قدموں میں بچھی سفید مٹی کی تہہ کو دیکھا۔ رُکھوں کے ذخیرے میں چھپا ہوا یہ کلرا ٹھا میدان پانچ چھ سو کرو لمبائی میں اور چوڑائی میں ہو گا۔ پہلے تو جھیل کے پانی رُکھوں کے تنوں تک آتے تھے پر اب وہ صرف بیچ میں سو ڈیڑھ سو کرو کے رقبے میں سمٹ گئے تھے۔ گہرائی میں بھی بس اتنے کہ تہہ کا کیچڑ صاف نظر آتا تھا اور چوپائے اُس میں کھڑے رہ سکتے تھے پر لیٹنے سے ڈوبتے تھے۔ اب بڑے پانی بھی کم آتے تھے اور اگر آتے تھے تو دریا سے نکل کر یہاں تک پہنچتے پہنچتے زمین ہی میں گُم ہو جاتے تھے اور یوں ہر برس یہ جھیل بھرنے کی بجائے کچھ اور سُوکھ جاتی تھی، کچھ اور سمٹ جاتی تھی۔ ہر برس پانی کے گرد ایک اور دائرہ بن جاتا، جہاں تک پانی پہلے تھا اور اب سُوکھ چکا تھا۔ ایسے دائرے پھیلتے ہوئے رکھوں کے اندر تک جاتے تھے کہ پانی بھی تو وہیں تک جایا کرتا تھا۔ اس کلرا ٹھی زمین پر جہاں سے جھیل ہٹ چکی تھی پرندے گرتے تھے اور مرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ اس مقام پر پرندے صرف مرنے کے لئے آتے ہیں اور دُور دُور سے آتے ہیں، کبھی اکّا دکّا اور کبھی اَن گنت ڈاروں میں وہ اِدھر آتے۔ اُن کے مردہ جسم گلتے سڑتے اور اُن کی بُو رُکھوں کے اندر تک جاتی پر وہ سب ایک ہی جگہ پر گرتے اور یوں اُن کی ہڈیوں کا ایک ٹیلا سا بن گیا تھا۔۔۔ اِسی ٹیلے پر وہ بھی گرا تھا اور اب پڑا تھا اگرچہ ابھی گلا سڑا نہیں تھا۔

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔

پاروشنی کا سایہ کلرا ٹھی زمین پر سفید ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنا سایہ دیکھتے ہی ڈر کے مارے

ہچکی لی آسے پاسے دیکھا اور فوراً اپنا مُنھ موڑ کر سُورج پاسے کر لیا۔ اُس نے پہلے کبھی بھی بُھول چوک میں بھی سُورج کی طرف پیٹھ نہیں کی تھی۔ اُس نے بڑوں سے سُن رکھا تھا کہ ایسا کرنے سے بُرا سامنے آتا تھا۔ پر آج تو وہ آسمان سے گرتے پرندے کو دیکھنے میں مگن انجانے میں ایسا کر بیٹھی تھی۔

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔

پاروشنی سُورج کو سامنے رکھ کر رُکھوں میں داخل ہوئی اور اُن کی گھنیری چھاؤں میں راستہ بنانے لگی۔ یہاں گرم نمی میں اُس کے بدن کے مسام کھلے اور سانس لینے لگے اور پسینہ اُس کی گردن سے رینگتا ہوا پیٹھ کو چھونے لگا۔ رُکھوں کے اس ذخیرے میں بارش اُترتی رہتی تھی اور یوں ایک گیلی ہوا دم سادھے اِدھر موجود رہتی تھی۔ رُکھوں میں پیپل اور املی کے رُکھ زیادہ تھے اور ان میں سے بیشتر اگرچہ کھوکھلے ہو چکے تھے لیکن کوئی بھی اُنہیں چُھونے کا سوچ نہیں سکتا تھا کیونکہ اِن رُکھوں میں یکسنا اور یکشنی رہتی تھیں، اُن کی روحیں جو دیکھتی تھیں۔ پیپل کا ایک بہت بڑا تنا اُس کے راستے میں آیا تو پاروشنی اُسے پھلانگنے کی بجائے سر جھکا کر اُس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی اور اُس کے گرد چکّر لگا کر واپس اپنے راستے پر آئی۔ چھاؤں اتنی گھنی تھی کہ کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا، کہیں کوئی ایک پتہ ہلتا تو سورج کی ایک کرن اس اندھیرے میں شتابی سے داخل ہوتی اور پھر جیسے تاریکی اُسے جذب کر لیتی۔ پر پاروشنی یہاں بھی دیکھ سکتی تھی اور نہ بھی دیکھ پاتی تو وُہ یہاں آنکھیں بند کر کے چل سکتی تھی۔ صرف وہ تھی جو رُکھوں کے اندر جھیل تک جاتی تھی، اور کوئی نہ جانتا تھا۔

"می آؤں۔ می آؤں" مور بولا۔ اور اس بار وُہ پاروشنی کو دیکھ کر بولا تھا۔ اُس کا اوپر والا ہونٹ دانتوں سے پرے ہوا اور پیپل کے پتّوں میں سے آتی روشنی اُن پر لشکی اور وُہ مسکراتی ہوئی اُس کے پاس سے گزر گئی۔ جب وُہ بانجھ عورتوں کے رُکھ کے قریب ہوئی تو پل بھر کے لئے رُکی، پیپل کی شاخوں اور خاص طور پر اُس کے موٹے اور اوپر اٹھتے ہوئے تنے کے گرد بے انت وَن سوتے دھاگے بندھے ہوئے تھے، ہر دھاگہ ایک ایسی عورت نے باندھا تھا جو خشک تھی اور فصل چاہتی تھی اور اپنے آپ کو ہرا بھرا کرنے کی اُمید پالتی تھی۔ ۔۔۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا، کم سے کم اُسے اِس پیپل کے ساتھ رنگین دھاگہ باندھنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئے گی، نیچے حدّت دیتے بدن کے گیلے ہوتے حِصّے نے اُسے یہی بتایا۔۔۔ ورچن! اُس حصّے میں تھرتھراہٹ سی ہوئی اور پاروشنی نے گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیا۔ اُس نے اپنی گیلی اُنگلیوں

کو ناک سے لگایا، وہاں گرم اور پھوٹنے والی مہک تھی جس میں فصل ہی فصل تھی۔

جہاں رُکھ ختم ہوتے تھے وُہیں سے ڈوبو مٹّی کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ انجان چلنے والا تو اِس میں ڈوب سکتا تھا کہ اوپر سے یہ ایسے تھی جیسے عام مٹّی ہو پر اُس پر چھوٹی چھوٹی گھاس اُگی ہو اور کہیں کہیں سرکنڈے اور دھامن اور کھبّل دکھائی دیتے ہوں۔ اِسے ہڑپ کرنے والی مٹّی بھی بولتے تھے کیونکہ جنور یا بندہ جو بھی ادھر آیا تو اِس نے اُسے اپنے اندر ایسے گم کیا کہ باہر کوئی نشان نہ ملتا کہ ادھر کوئی تھا کہ نہیں۔۔۔ گھاس بھی واپس آجاتی اور اُس پر مچھر اور مکوڑے پہلے کی طرح منڈلانے لگتے۔ پر اس ڈوبو مٹّی میں بھی پکّے پیڈے راستے تھے جن پر لوگ چلتے تھے اور پاروشنی ان راستوں کو جانتی تھی۔ اُس نے یہاں رُک کر آنکھیں بند کیں اور ہوا کو اپنے اندر کھینچا، تھوڑی دیر تک دم روکا اور پھر اُس کے نتھنوں میں کترن کی بوجھل خوشبو آئی اور اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ دائیں ہاتھ پر کترن کی جھاڑی کے ساتھ وہ راستہ شروع ہوتا تھا جو چھپری اور کھیپ کی جھاڑیوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا پیڈی مٹّی یعنی کھیتوں کے قریب جا نکلتا تھا۔ دیکھنے میں تو یہ بھی ڈوبو مٹّی ایسا ہی لگتا تھا، وہی چھوٹی چھوٹی گھاس اور باریک گتّی جو اُس کے اوپر اُڑتی رہتی پر اندر سے یہ اُکا پکّا پیڈا تھا۔ پاروشنی دھیرے دھیرے دیکھ دیکھ کر پاؤں دھرتی اس پر چلنے لگی۔ کہیں کہیں نرم مٹّی بھی آجاتی اور اُسے ٹخنوں تک دھنسے پاؤں کو کھینچ کر باہر نکالنا پڑتا۔ دریا کے بڑے پانی اس برس ابھی نہیں آئے تھے ورنہ یہ راستہ بھی ڈوبو ہو چکا ہوتا۔ کترن کی جھاڑیوں کے ایک جُھنڈ میں اُسے پندرُو پھر دکھائی دیا۔ وُہ شاندار لشکتی گردن اٹھائے خاموش کھڑا جیسے گم تھا، پاؤں، سَر یا آنکھوں میں کوئی جنبش نہیں صرف کان کبھی کبھار اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھر جاتے۔ اُس کی آنکھیں اتنی تیز نہیں کہ پاروشنی کو دیکھ سکے۔ وُہ گم کھڑا تھا اور اُسی سَمے پاروشنی کے پاؤں تلے ایک سُوکھی ہوئی ٹہنی ٹوٹی تو اُس کے کان اس آواز کی جانب پھرے، اُس دم ہوا کا ایک جھونکا پاروشنی سے اُدھر کو گیا تو اُس نے نتھنے پُھلا کر سُونگھا اور کسی کی موجودگی کو جان کر ہوشیار ہوا اور پھر پلانگیں بھرتا ڈوبو مٹّی پر سے بھاگتا رُکھوں کے اندر چلا گیا۔ پندرو ڈوبو مٹّی پر اتنا بھار ہی نہیں ڈالتا تھا کہ وُہ ڈوب سکے۔ پاروشنی جب کبھی جھیل کو جاتی تو یہ چنکارہ ہرن کنکھ رنگا، سفید پیٹ والا اپنی چھوٹی سی دُم جھاڑتا آنکھیں جھپکتا اُسے کہیں نہ کہیں ضرور دکھائی دے جاتا۔ وُہ اُسے پندرُو کہتی تھی۔ پاروشنی اپنے اندر میں مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تین کرُو کا پینڈا کرنے کے بعد اُس کے پیروں نے بتایا کہ ڈوبو مٹّی ختم ہو رہی ہے، وہ اب زمین میں کم دھنستے تھے، اور وُہ پلانگیں بھرتی ہوئی تیزی سے چلنے لگی۔

اُنہوں نے اُسے ڈوبو مٹی سے باہر آتے تو نہیں دیکھا تھا کیونکہ وُہ سویرے سے اپنی کسّیوں اور کُدالوں پر جھکے زمین کھود رہے تھے۔ بڑے پانی کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کب آجائے۔ یہی دن اُس کے آنے کے تھے اور زمین کا یہ ٹکڑا اُن کے ذمّے پڑا تھا۔ ہاں جھوریا پسینہ پونچھنے کو کھڑا ہوا تو وہ پھوگ کی جھاڑیوں کے درمیان چلتی دکھائی دی۔ اُن دونوں نے جب اپنے بھرا کو دوبارہ جُھکتے محسوس نہ کیا تو وہ بھی کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھے ہو گئے اور اُدھر کو دیکھنے لگے جدھر تیسرا دیکھتا تھا۔ اس بار مینہ کم برسا تھا اور پھوگ پر پتّے نہیں تھے صرف خشک ٹہنیوں کا جھاڑ تھا جس کا چاندی رنگ دُھوپ میں ٹھاٹھیں مارتے پانی کی طرح لشکارے مارتا تھا۔ اور ان خشک لشکتے جھاڑوں میں پاروشنی چلی جارہی تھی۔ پھوگ کی ٹہنی اگر خشک ہو تو اُس کا رنگ تازہ راکھ ایسا ہوتا ہے پر اس میں ایسی لشک ہوتی ہے کہ گہری رات میں صرف ایک پھوگ دور سے جلتے الاؤ کی طرح دکھائی دیتی رہتی ہے۔ اور یہاں ان گنت الاؤ تھے جن کے بیچ پاروشنی چلی جاتی تھی۔

تینوں بھراؤں سے ایک کرُوکے فاصلے پر ماتی کا سیاہ جسم ایک کسّی پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے کانوں تک جب کسّیوں کی کُھس کُھس خاصی دیر تک نہ پہنچی تو اُس نے اپنی چھاتیوں پر سے لیڑا ڈھیلا کیا اور اُن پر تیرتے پسینے کو ہتھیلیوں سے پونچھا اور کھڑی ہو گئی۔ وُہ تینوں بلکہ چاروں اُس نے ایک ہی رات میں جنے تھے اور اُنہیں موت کے یَم کتّوں سے بچائے رکھنے کے لیے اُسی وقت دریا پر گئی تھی اور اُن چاروں کی ٹانگیں پکڑ کر اُنہیں کچھ دیر کے لئے پانی میں ڈبو دیا تھا۔ جب انہیں باہر نکالا تو اُن میں سے ایک بے جان لٹکتا تھا اور باقی تینوں پھیپھڑے پُھلا پُھلا کر چیختے تھے اور اُن کے ناک مُنہ سے پانی جاری تھا۔ اُن کے جُنے سوہنے سیاہ تھے، قد چھوٹے، ناکیں چپٹی اور بال گھنگھریالے تھے۔ وہ تینوں الگ سے کوئی کام کاج نہ کر پاتے، ہمیشہ جنوروں کی طرح سانجھے کام کرتے۔ اور اب وُہ سانجھے ہی پاروشنی کو دیکھ رہے تھے اور اُنہیں اُن کی میّا ماتی دیکھ رہی تھی۔ ماتی کے چھتّے سفید دانت دُھوپ میں لشکے اور اُس نے اپنے موٹے ہونٹوں کو پھیلا کر ہیک لگائی "۔ جھوریا"۔ وُہ تینوں جھوریا تھے۔ پہلا دوجا اور تیجا جُھوریا۔ ماتی کی آواز سنتے ہی تینوں کی نظریں پاروشنی سے الگ ہوئیں اور زمین پر جُھک گئیں۔ وُہ اُن کی میّا تھی، بڑی میّا کا زمینی رُوپ، وُہ اُس کے چاکر تھے۔

پاروشنی نے اُن تینوں کو کسّیاں چھوڑ کر کھڑے ہوتے اور پھر ماتی کی ہیک پر دوبارہ زمین پر جُھکتے دیکھا۔

وُہ اپنے حصّے کی زمین کھود چکی تھی۔ ڈوبو مٹی اور دریا کے درمیان پھیلی ہوئی زمین پُوری بستی

کی تھی۔ مینہ اُترنے سے پہلے اور بڑا پانی کناروں سے باہر پھیلنے سے اگیتے سارے باسی اُسے کھودنے کے لئے اپنا اپنا حصّہ بانٹ لیتے اور پھر اُس میں کنک۔ جَو اور مٹری وغیرہ کے بیج ڈال کر اُسے پدھر کر دیتے۔ کھیتوں کے آسے پاسے گارے کی دیوارسی بنا دیتے تاکہ پانی اُن کے اندر آکر ٹھہرا رہے اور جذب ہو جائے۔ جب پھوٹ پڑتی، بُوٹے بنتے اور اُن میں بیج پڑتا تو وُہ سب کا سانجھا ہوتا۔ کبھی کبھار جب بیج زمین میں پڑا سُوکھنے لگتا اور اُس میں پھوٹ نہ پڑتی تو بڑی میّا کی ایک مورتی جو پکلی کی پکائی ہوئی ہوتی کھیتوں کے بیچ رکھ کر بستی کی کوئی جمی۔ بدھری یا کواسی اُس کے پاس لیٹ جاتی اور کوئی مندرا۔ پنڈو یا چپّا اُس کے بیچ اپنا بیج اُتارتا اور یُوں دنوں میں بڑی میّا کے زور سے زمین کا بیج بھی پھوٹ مارنے لگتا۔ ماتی کے تینوں پُتروں کا بیج بھی ایسے ہی بڑی میّا کے سامنے کھیت میں لیٹے ہوئے ہُنگانے ڈالا تھا۔ ہُنگا اُسی رات دریا میں نہانے گیا تو پھر لوٹا نہیں۔ دوسرے کنارے چلا گیا جہاں سارے مرنے والوں کی رُوحیں جاتی ہیں۔ پاروشنی بھی بڑی میّا اور کھیتوں کے لئے سب کچھ کر سکتی تھی لیکن اُس کا جی چاہتا تھا

صرف ورچن؟ یا ہمرو ہو؟۔ کوئی بھی۔۔ ورچن یا سَمرو کون؟ اُس کے بیج بدن میں پھر ایک تھرتھراہٹ سی ہوئی اور وُہ گھبرا کر تیز تیز چلنے لگی۔ جن کھیتوں میں سے وُہ گزر رہی تھی اُنھیں بھی کھودا جا رہا تھا۔ کئیوں نے یہیں بستی سے باہر کھیتوں میں ڈیرے بنا لئے تھے اور اپنا مال ڈنگر بھی ساتھ لے آئے تھے۔ بڑے پانی کے آنے پر اُنہوں نے بستی کو لوٹنا تھا۔ اُس کی آہٹ ان ڈیروں کے پاس آتی تو کتّوں کی دُموں کو پہلے خبر ہوتی اور وہ دُھول میں دَھپ دَھپ چلنے لگتیں اور جب وُہ بھونکنے کو مُنہ کھولتے تو پاروشنی کو جان لیتے اور پھر لیٹ جاتے۔

جہاں بستی کا پہلا چھپّر تھا اُس سے دو تین کرَوا دھر لمبے سینگوں والے بیلوں کا باڑا تھا۔ اِن بیلوں کے کوہان نہیں تھے اور انہیں اگر سامنے کی بجائے ایک پاسے سے دیکھا جائے تو یُوں لگتا تھا جیسے اُن کا صرف ایک سینگ ہے۔ یہ پوتر بیل صرف نسل بڑھانے کے کام میں لائے جاتے اور ویسے سارا دن بیکار بیٹھے جُگالی کرتے رہتے۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے بستی کا سب سے بوڑھا شخص دُھروا وہاں بٹھایا گیا تھا مگر لگتا تھا کہ وُہ جانے والا ہے کیونکہ اب وُہ ہر رات دریا کے پاسے جاتا اور کنارے پر بیٹھ کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھتا اور روتا رہتا۔ اُس کی ہڈیاں دن بہ دن بڑی ہوتی جا رہی تھیں اور وُہ سوتے میں بھی یَم کتّوں کے رونے کی آوازیں سنتا رہتا تھا۔ جب پاروشنی اُس کے قریب آئی تو وہ چارے کے اُن چھوٹے چھوٹے گٹھوں کو باڑے کے اندر

لے جارہا تھا جو بستی والے سویرے سویرے اُس کی دیوار کے ساتھ جوڑ گئے تھے۔

"مامن دھروا" پاروشنی رُک گئی۔

دُھروا ایک گٹھے پر جھکا ہوا تھا، اُس نے ٹیڑھی آنکھ سے اُدھر کو دیکھا اور پھر اُسی طرح جھکا ہوا پاروشنی کے پاس آگیا "کسی کے دل میں میرا خیال نہیں۔ میرا کس بَل میرا زور تو جا چکا۔ چارے کے گٹھے دیوار کے ساتھ لگا کر چلے جاتے ہیں، اُنہیں پتہ نہیں کہ میں نے کتنے بڑے پانی دیکھے ہیں، مُجھ میں اب ہمت نہیں"۔

پاروشنی بولی نہیں، دیوار کی طرف گئی اور ایک گٹھا اُٹھا کر باڑے کے اندر لے گئی۔ پیشاب اور لید میں لتھڑے ہوئے بیلوں نے چارہ لانے والے کی چال اور ڈھنگ میں فرق جانا تو موندھی ہوئی آنکھوں کو کھولا اور پھر اپنی دُمیں باریک لید میں چلا کر پہلے سے بھی زیادہ چوڑے ہو کر جُگالی کرنے لگے۔ کُل چھ گٹھے تھے اور پاروشنی انہیں ڈھوتے ہوئے یوں نڈھال ہوئی کہ باڑے میں جو لید اور پیشاب کی بُو تھی وُہ اُس کے اندر اتھل پتھل کرتی تھی۔

"مامن دھروا تمہارا کام کاج تو ختم ہوا" وُہ باہر آکر اُس سے ذرا پرے ہو کر بیٹھ گئی۔ دُھروا کی مہین ٹھوڑی پر گھنگھریالے بالوں کا صرف ایک گچھا تھا جو اُس کے کالے شاہ رنگ کی وجہ سے دکھائی ہی نہیں دیتا تھا البتہ ہوا کے کسی جھونکے سے سرسراتا تو دُھروا اُسے فوراً ٹھوڑی کے ساتھ ایسے چپکانے کی کوشش کرتا جیسے وہ اُڑ جائے گا۔ اُس کی چھوٹی سی کھوپڑی پر سیاہ ماس ایسے کسا ہوا تھا کہ جونہی وُہ بولنے کو مُنہ کھولتا اُس کے سر کی ہڈی بالکل ہی ننگی دکھائی پڑتی۔

"آج کا کام کاج تو ختم ہوا پاروشنی۔ پر اِس آسے پاسے۔۔" اُس نے سوکھتی اور اُبھری ہوئی رگوں والا ہاتھ چاروں اَور گھمایا "اور اُدھر۔۔۔ اُوپر" اُسنے آسمان کی طرف انگلی کھڑی کی"۔۔ جو مانا ہے۔ جسے راضی رکھنے کو ہم بڑی میّا کے پاس بیٹھتے ہیں اور لِنگ پر پُھول تیل چڑھاتے ہیں، جو بیچ میں سے بُوٹا نکالتا ہے اور جس کے یَم کتّے ہمیں دریا کے اُس پار لے جاتے ہیں۔۔۔ وُہ جانے میرا کاج کب مُکائے گا"

"مامن دُھروا۔ مانا ہے بھی کہ نہیں؟"

دُھروا نے یکدم پاروشنی کی طرف دیکھا جو آلتی پالتی مارے اُس سے دو کرو کے فاصلے پر دُھوپ میں بیٹھی تھی" مُجھے پتہ نہیں پاروشنی۔ پر میں سوتے میں یم کتّوں کو دیکھتا ہوں اور وُہ تیز داتوں والے سیاہ جنور مجھے کوئی دُکھ نہیں دیتے، بس میرے سامنے بیٹھ کر بُوتھیاں اوپر اٹھائے روتے رہتے ہیں۔۔۔ وُہ کتّے مانا ہی تو بھیجتا ہے"

"کیا پتہ مامن، کیا پتہ۔"

دُھروا نے اپنی ٹھوڑی پر سرسراتے بالوں کو غصّے سے چپکایا "کیا کہتی ہو؟"

"مامن۔ اگر کوئی بھول چوک میں سُورج کی طرف پیٹھ کر لے۔ تو کیا ہوتا ہے؟"

"تو مانا اپنے یَم کُتوں کو اُس کے گھر میں بھیج دیتا ہے۔۔ تُو نے ایسا کیا؟"

"بُھول چوک میں مامن۔" پاروشنی کے چہرے پر ایک سیاہی پھیلنے لگی۔ دُھروا کُچھ چونکا اور پھر مانا کے کسی جانُوں کی طرح یقین کے ساتھ بولا "تُو لِنگ پر تیل ڈال، اُسے دُودھ لگا اپنے ہاتھوں سے اور جو بُھول مل جائیں تو وُہ اُس پر رکھ۔"

پاروشنی نے جو سنا، وہ اُسے اچھا نہ لگا۔ اُس کا ماتھا جو پدھرا کھیت تھا اُس۔ مینڈھیں سی بننے لگیں "مجھے جو اور کام کاج نہ پوتب یہ کرتی پھروں مامن۔۔ ہیں مامن۔۔ سویرے مجھے اپنے کنویں میں سے پانی نکال کر سب کے گھڑے اور جھجھریاں بھرنے ہوتے ہیں۔ اپنے حصّے کی زمین کھودنا ہوتی ہے۔ بڑا پانی آنے سے پہلے اُس میں بیج ڈالنا پڑتا ہے، اور پھر کھانے پینے کا اور۔۔ جسے اور کوئی کاج نہ ہو وُہ یہ سب کرے تو کرے۔۔ میں تو۔۔۔" ۔۔ پاروشنی وہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

جھیل اور دریا کے بیچ دس کوس کا فاصلہ تھا۔ دو کوس میں رُکھ تھے، دو میں ڈوبو مٹی اور پھر دریا تک کھیت اور کہیں کہیں ٹیلے اور جھاڑیاں۔ بستی سے ذرا ہٹ کر چیوا اور اُس کی بھیڑوں کا چھپّر تھا۔ پاروشنی اب دریا کے قریب آ رہی تھی۔ بستی بائیں بازو پر رہ گئی تھی۔ پیڈی مٹّی پر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس کے تلووں تلے بے انت روڑے، چھوٹے چھوٹے گیٹے اور ٹھیکریاں پچھلے پہر کی گرمی میں پُھنک رہے تھے۔ کنکر اور چھوٹے چھوٹے پتھر تو اُس راستے کا پتہ دیتے تھے جس پر ایک کوس پرے ہٹنے سے پہلے دریا چلتا تھا مگر ٹھیکریاں پکلی کے آوے کی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے گھڑوں اور صحنکوں کی یہ ٹھیکریاں آوا چڑھانے کے وقت بھانڈوں اور برتنوں کے درمیان رکھی جاتی تھیں تاکہ وہ جُڑ نہ جائیں اور پھر بعد میں پکلی انہیں آوے سے دُور یہاں تک پھینک دیتی تھی۔ اُس کے جلتے ہوئے تلووں نے پکلی کو کوسا اور وُہ پیّاں بھار اُن جلتی ہوئی ٹھیکریوں پر کم سے کم بھار ڈالتی آگے بڑھنے لگی۔ دریا کی طرف سے ہوا کا ایک جھونکا آیا جس کی ٹھنڈک میں ایک گرم سانس بھی گھل کر آتا تھا۔ پکلی نے آوا چڑھا رکھا ہے، پاروشنی نے سوچا اور مہاندرے سے مَس ہوتی ٹھنڈی اور گرم باس بدن میں اتارتی منہ کھول کر چلنے لگی۔ اسے اب پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے کترن کی جھاڑی کی ایک جڑ منہ میں رکھی اور اُسے چبانے لگی۔ یُوں پیاس

کچھ کم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اُسے پکلی کے چھپّر دکھائی دینے لگے۔ اور اب تھکاوٹ نے اُسے بوجھل کرنا شروع کر دیا، اُس نے اپنے بدن کو ذرا ڈھیلا چھوڑا تو پاؤں گھسٹنے لگے پر جونہی گرم ٹھیکریاں اُن پر لگیں تو وُہ پھر پنّوں پر چلنے لگی۔

پکلی دونوں پاؤں جوڑے، گھٹنوں کے بیچ ایک گیلی اور کچّی جھجھر رکھے اُس پر جھکی تھی۔۔۔ اُس کی اُنگلیوں میں ہاتھ بھر کی ایک سبز ٹہنی تھی جس کا سِرا کُوٹ کر نرم کیا گیا تھا۔ وہ اِسے دائیں بازو میں رکھے گیری کے پیالے میں ڈبوتی اور پھر جھجھر پر بُوٹے اُلیکنے لگتی۔ پاروشنی کو اپنے چھپّر کی طرف آتے دیکھ کر اُس نے ٹہنی کو ایک نظر دیکھا اور پھر اِسے گُھما کر اُس کی جانب پھینک دیا "یہ تو گیری نہیں چوستی۔ سو برے سے چار جھجھریں خراب ہوئی ہیں۔"

پاروشنی چپکے سے بیٹھ گئی۔

"ٹہنیاں لائی ہو؟"

"بُھول گئی" پاروشنی بولی اور ہتھیلیاں جھجھر کی گولائی پر رکھ دیں۔ گیلی مٹی کی ٹھنڈک اُس کے تلووں تک چلی گئی۔ پکلی کے اُلیکے ہوئے بوٹے اور مورتیں کچّی مٹی میں رس بس چکے تھے۔ پکلی انہیں پہاڑی مٹی گیری کو گھول کر بناتی۔ گیری تین رنگ کی ہوتی تھی، کالی، پیلی اور رتّی۔۔ جھجھر کے پیٹ کی گولائی پر آگے پیچھے مچھلی کے چانے بنے ہوئے تھے، پیپل کے پتّے تھے، ایک رُکھ کی شکل تھی اور اُس پر دو پکھیرو تھے اور ان کے پَر الیکتے ہوئے پکلی کی ٹہنی سے کالی گیری مٹّی میں جذب ہونے کے بجائے سارے برتن پر پھیل گئی تھی۔

"پکلی یہ بیل بوٹے تم کیسے اُلیک لیتی ہو؟"

پکلی نے چھپر سے دُور آوے کے گرد بیٹھے اپنے بچّوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیز دھوپ اور آگ کی نزدیکی سے بے پروا اُس میں کھرپڑ ڈال رہے تھے۔ سوکھی جھاڑیوں اور لکڑی کے علاوہ آوے میں سُلگانے کے لئے کھرپڑ سے بہتر کوئی ایندھن نہ تھا، یہ وُہ گوبر تھا جو کھیتوں اور راستوں پر پڑا پڑا دھوپ سے سوکھ جاتا تھا۔ وہ ایک چھڑی کے سِرے پر بندھے پتھر سے سلگتے ہوئے ایندھن سے برتنوں کو ڈھک رہے تھے۔ دریا کی طرف سے ہوا شرلاٹے بھرتی ہوئی آتی اور آوے کے سوراخوں میں داخل ہو کر اُپلوں میں سے گزرتی آگ کے چھوٹے چھوٹے بُلبلے بنا دیتی اور ان کے آر پار دکھائی دیتا تھا۔ جونہی آگ کسی جگہ پر شعلے میں بدلتی تو دونوں بچّے فوراً اُسے چھڑی کے ساتھ دبا دیتے کیونکہ برتن بنانے والوں کا کہنا تھا کہ آوا جلے تو گیا اور سُلگے تو بنا۔ آوا چڑھے ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی ورنہ ہوا میں اس کی بُو ہوتی۔

"میں نے کیا پُوچھا پکلی۔" پاروشنی نے پھر کہا۔

"ہاں یہ بیل بوٹے؟۔۔۔ یہ بیل بُوٹے میرے سر میں نہیں آتے۔ یہ تو ٹہنیوں میں ہوتے ہیں اور آپ ہی آپ جھجھروں۔ صحنکوں۔ چاٹیوں، ڈولوں اور گھڑوں پر بن جاتے ہیں"۔

"مُجھ سے نہیں بنتے۔" پاروشنی نے اپنے سُوجے ہوئے پاؤں کو دباتے ہوئے پکلی کی طرف دیکھا۔

"یہ تمہارا کاج نہیں ہے میرا ہے۔" پکلی ہنس دی۔ اُس کا مُنہ کُھلا تو پاروشنی نے دیکھا کہ اُس کا ایک اور دانت کم ہو گیا ہے "۔۔۔۔ جیسے دریا میں پانی ہے اور بیج میں بُوٹا ہے ایسے ہی جس کا یہ کاج ہوتا ہے اُس کے پنجر میں یہ بیل بُوٹے ہوتے ہیں جو آپ ہی آپ بنتے ہیں"

"اور یہ جھجھروں پر مچھلی کے چانے کیوں بناتی ہو؟"

"تجھے بتایا ہے کہ آپ بنتے ہیں۔ اور مُجھے تو ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ جو میں بناتی ہوں تو مچھلی کے چانے ہیں، تو نے آج بتایا ہے"

"جھجھر اور گھڑے میں پانی ہوتا ہے اس لئے اُس پر پانی کے جنور کی مُورت بناتے ہیں پکلی"

"تجھے زیادہ سمجھ ہے تو پوچھتی کیوں ہے۔۔ کیوں آئی ہے؟"

"جھجھر لینے۔"

"چھپّر کے اندر سے لے آ۔ پکی ہوئی"

دریائی سروٹ اور جھاڑیوں سے بنے ہوئے چھپّر کے نیچے فرش پر پَرالی بچھی ہوئی تھی اور اُس پر گیرو سو رہا تھا۔ آہٹ پر اُس نے ایک آنکھ کھولی اور پھر پاسا پلٹ کر سو رہا۔ گیرو کے چار چفیرے پکے ہوئے برتنوں کی پالیں لگی تھیں۔ پاروشنی نے ایک جھجھر اُٹھائی پر وہ بھاری لگی اُس میں مٹی زیادہ لگ گئی تھی۔ پھر اُس نے دوسری اُٹھائی تو وہ ہلکی لگی، اُسے ہتھیلیوں میں تھامے وُہ باہر آ گئی۔

"گیرو سے بھی کام کاج لیا کر۔"

"مانا نے عورت ذات کو زیادہ زور دیا ہے، زیادہ بُوجھ دی ہے۔ مہامیتا بھی تو عورت ہے" پکلی جو ایک صحنک کے درمیان میں بُوٹے اُلیک رہی تھی سر اُٹھا کر بولی "مرد ذات کا کیا ہے، چھوٹے اور نیچ کام کر نایا بیج ڈالنا بس۔۔۔ تیری طرف چار جھجھریں، تین گھڑے، دو ہانڈیاں، ایک چولہا اور ایک صحنک ہو گئی۔ کنک آنے پر یاد رکھنا" اور پھر صحنک پر جُھک گئی۔

پاروشنی نے پکلی کے ہاتھ میں پکڑی ٹہنی کو دیکھا جو کالے پانی میں ڈوبتی اور صحنک پر چلنے

لگتی آپ ہی آپ۔ درمیان میں گھنے رُکھوں کے دو جنور تھے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے پھنکارتے ہوئے اور ایک بندہ جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے اُنہیں پکڑے ہوئے تھا۔ ایک جنور کی ٹانگ کو ایک غراتے ہوئے کُتے نے پکڑ رکھا تھا۔ اِس ساری مورت کے آسے پاسے مور اور ستارے بنے ہوئے تھے۔ پکلی نے پہلی ٹہنی کو پھینک کر ایک اور ٹہنی کو اٹھایا اور اُسے اپنے بچے کھُچے دانتوں تلے چبا چبا کر نرم کیا۔ پھر اسے بڑی احتیاط سے کالے پانی میں ڈبو کر صحنک پر بنے ہوئے مور کے پیٹ میں چند لکیریں کھینچیں تو ایک انسانی شکل بن گئی۔

"می آؤں، می آؤں" رُکھوں کا مور پاروشنی کے اندر بولا۔ وہ جانتی تھی کہ جب پنجر خالی ہو جائے تو اُسے خالی کر دینے والا سانس بیلوں اور موروں میں چلا جاتا ہے اور یہی جنور اُسے دریا کے پار لے جاتے ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کنک آنے پر یاد رکھنا"

"پر دیکھ لے چھوٹی جھجھر لے جا رہی ہوں اور اسی کو بھر کر کنک دوں گی۔" پاروشنی نے لچکے بغیر اپنے چوڑے کُولہوں پر بڑی آسانی سے جھجھر رکھ لی اور چلنے کو تھی کہ پکلی بولی "تیرے اندر کچھ ہے؟"

پاروشنی کی آنکھیں کُچھ اور سیاہ ہو گئیں "کیوں پوچھتی ہے؟"

"تیرے کُولہے چوڑے ہوتے جا رہے ہیں اور اُن پر لُنگی کسی جا رہی ہے اس لئے۔"

"میں ہوں ہی ایسی۔" اور اپنا غصہ دکھانے کے لئے ایک پاؤں زمین پر مار کر وُہ آوے کی طرف چلنے لگی۔

پکلی کے دونوں بچّے پنڈو اور سُکرا اپنے کام میں جُتے ہوئے تھے۔ آوے کے پیٹ میں پکلی کے بنائے ہوئے برتن ایک خاص ترتیب سے اوندھے رکھے ہوئے تھے اور اُن کے بیچ ٹھیکریاں اور راکھ بھری ہوئی تھی۔ برتنوں کے علاوہ بچّوں نے اپنے کھیلنے کو مٹّی کی بیل گاڑیاں بنا کر آوے میں رکھی ہوئی تھیں۔۔۔ کُچھ چھوٹے چھوٹے عجیب مُہاندروں والے بُت تھے اور کُچھ منکے بھی تھے۔ پنڈو اور سُکرا اپنے کام میں ایسے گُم تھے کہ اُنہوں نے اپنی طرف آتی پاروشنی کے پاؤں تو دیکھ لئے پر سر اُٹھا کر اُسے نہ دیکھ پائے۔ سلگتے آوے کا دُھواں آسمان کو جاتا تھا۔

"مہامیّا کی کوئی مُورتی نہیں پکائی؟"

"نہیں، وُہ پکلی آپ بناتی ہے اور پھر آپ ہی پکاتی ہے" جانے اُن میں سے کس کے جُھکے ہوئے سر میں سے آواز آئی۔

پاروشنی نے کھسکتی جھجر کو ذرا اُوپر کر کے کمر کے ساتھ لگایا اور دریا کی طرف چلنے لگی۔
اِدھر اُدھر بکھری پکلی کے آوے کی ٹھیکریاں اب اتنی گرم نہ تھیں۔
آدھ کوس چلنے کے بعد اُس کے سامنے سروٹ اور کاہی کے سرسراتے جُھنڈ کی ایک دیوار آئی اور وُہ بلا جھجھک اُس میں داخل ہو گئی۔ ایک رینگتا ہوا کچھوَ اُس کے پاؤں کی آہٹ پر زمین کے ساتھ لگ کر پتھر ہو گیا۔ سروٹ کے باریک اور تیز دھار کے پتّے پاروشنی کی باہوں پر زبانیں رکھنے کی کوشش کرتے جاتے اور کبھی کبھار اُس کے منہ سے درد کی ایک ہلکی سے چیخ نکلتی جب یہ پتّے اُس کی باہوں پر سُرخ لکیر کھینچنے میں کامیاب ہو جاتے۔ پر وُہ اپنے چوڑے تتھنوں میں نمی کی باس اُتارتی جاتی تھی اور سروٹ کے پتّوں کی کاٹ سے لاپرواہ جھجھر کو تھامے اور دوسرے ہاتھ سے سروٹ کو آسے پاسے ہٹاتی چلتی جاتی تھی۔ اُس جُھنڈ میں اور کوئی نہ تھا اور اُس کے چلنے سے جو سرسراہٹ پھیلتی تو وہاں آرام کرتے پکھیرو یکدم پُھر پُھر اُڑنے لگتے۔ وُہ اونچے سروٹوں میں سے نکلی تو گھنی جھاڑیوں میں سے ریتلی زمین کے ٹکڑے نظر آنے لگے۔ جھاڑیوں کے خاتمے پر وہ رُکی۔ اُس کے قدموں میں بچھی زمین دھیرے دھیرے اونچی ہو کر ایک ٹیلے کی صُورت اختیار کر رہی تھی۔ آسمان اُس کی آنکھوں کے برابر تک جھکا تھا۔ وُہ جُھکی اور جھجھر کو سنبھالتی ہوئی ایک بُھربھری ڈھیم اُٹھا کر پورے زور سے گھما کر ٹیلے کے پار پھینک دی۔ وُہ ایسے ہی تھمی رہی جھجھر پر ہاتھ رکھے، سانس روکے اور۔۔۔ دُور ایک ہلکی سی چھپاک پھیلی، ڈھیم دریا میں گری تھی۔ وہ یہاں سے نظر نہ آتا تھا پر وہاں موجود تھا۔ اِس چھپاک کی آواز سے اتنے کوسوں کی تھکان نے اُس کے پنڈے کو یکدم چھوڑ دیا اور وُہ ہلکی اور بے تھکن ٹیلے پر چڑھتی گئی۔ اُس کی نظروں کے آگے آسمان نیچا ہوتا گیا یہاں تک کہ اُس کی نیلاہٹ پانی کی ایک لکیر میں چلی گئی۔ یہ گھاگرا تھا۔

وُہ پاؤں سنبھالتی ٹیلے سے اُتری اور کنکروں کی گرم تہہ پر چلتی دریا کے کنارے تک آ گئی۔ اُس نے جھجھر کو زمین پر رکھنے کی کوشش کی تو وُہ ایک پاسے لُڑھک گئی۔ اُس نے چند ٹھیکریاں جمع کیں اور اُن کی ٹیک بنا کر جھجھر کو اُن پر ٹکا دیا۔ پانی کو پیاس سے دیکھتے اُس نے آسے پاسے دیکھے بغیر اپنے سینے پر کسا ہوا لیڑا ڈھیلا کر کے کھول دیا، لیڑے کی پکڑ سے چھوٹنے پر اُس کی چھاتیاں پل دو پل کے لئے ایسے تھرتھرائیں جیسے چنکارے ہرن کی پیٹھ پر زہریلی مکھی بیٹھ جائے تو وُہ ہلتی ہے۔ تھرتھرائیں اور پھر اپنے بوجھ کو سہار کر پنڈے کا ایک خاموش حصّہ بن گئیں۔ دریا کی باس کو اُن کی اٹھان نے ایک ناک کی طرح سُونگھا اور اپنے اندر رچایا۔ بستی کی ساری عورتیں

اپنے اوپر والے حصّے کو نہیں ڈھکتی تھیں، صرف وُہ جو بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے ڈھیلی پڑ چکی تھیں یا وُہ جنہیں چلتے پھرتے اُن کے بوجھ کی وجہ سے اُنہی پر تھکان ہو جاتی تھی ایسا کرتی تھیں۔ پاروشنی پر بوجھ بہت تھا۔ پھر اُس نے لونگی کے لڑ کھولے، ہاں وُہ بہت کسی ہوئی تھی، اُس نے کُولہوں کے گرداگرد ہاتھ پھیرا تو ماس یُوں دبا اور ابھرا ہوا تھا جیسے رات اُس حصّے پر کوئی زہریلا برساتی کیڑا چل گیا ہو۔ اُس نے لونگی اُتار کر جھجھر کے ساتھ ٹھیکریوں پر رکھ دی اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔

پاروشنی اپنی نسل کا خاص قد بُت لئے ہوئے تھی۔ ہلکا سیاہی مائل رنگ، گھنگریالے اور بُھورے بال جو ایک سُتھرے گھونسلے کی طرح سر پر رکھے ہوئے تھے۔ بھنویں اُوپر کو اٹھی ہوئیں، ناک چوڑی مگر اونچی، جبڑا ذرا آگے کو نکلتا ہوا جیسے بُھوکے جنور کا ہوتا ہے، قد بُت ایسا کہ کنک کی فصل میں چلتے ہوئے پہلی نظر پر دکھائی نہ دے اور سروٹوں میں گم ہو جائے۔ ہونٹ موٹے اور بھرے بھرے۔ اور کُولہے پھنیر سانپ کے پھیلے ہوئے پھن کی طرح۔ اُس نے پہلا قدم پانی میں رکھا تو جھجھکتے ہوئے رکھا اور پھر اُس کے پاؤں اُس میں ایسے اٹھنے لگے جیسے وہ عام زمین پر چلتی ہو۔ دس بارہ گز کے بعد پانی ذرا گہرا ہونے لگا اور وُہ اِسے اپنے پنڈے پر چڑھتے اور ٹھنڈک اُترتے محسوس کرتی آگے ہوتی گئی۔ وہاں اتنا پانی تھا کہ وُہ اگر بیٹھ جائے تو گردن تک آئے اور اُس میں اپنے آپ کو دھو سکے تو وُہ اُس میں بیٹھ گئی۔ اُس نے ناک پانی پر رکھی اور پھر سارے چہرے کو پانی میں ڈبو کر اُسے جھٹکتی اور آنکھوں کو زور زور سے بھینچتی رہی۔ یوں اُس نے چہرہ دھویا۔ اب اُسے زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے آنکھیں پانی کے برابر لا کر دریا کو دیکھا جو پہاڑ پاسے سے بہتا آرہا تھا۔ پانی بچھا ہوا برابر تھا۔ کہیں جھاگ نہیں تیرتی تھی جو یہ بتاتی کہ اُدھر مینہ اُتر رہا ہے۔ پانی میں سے کسی پہاڑی بُوٹے کے ڈنٹھل پتّے نہ اُبھرتے گم ہوتے تھے جو یہ پتہ دیتے کہ اُدھر آس پاس کا پانی دریا میں داخل ہو رہا ہے۔ پاروشنی نے گردن کو بل دے کر اپنا دایاں کان بہاؤ کے قریب کیا اور سُنا، دریا خاموش تھا بول نہیں رہا تھا جو معلوم ہوتا کہ بڑے پانی آنے کو ہیں۔

اس بار بڑے پانی کو دیر ہو گئی تھی۔

اُس نے سُنا تھا کہ بہت پہلے بستی کے بچاؤ کے لئے دریا کے ساتھ ساتھ ایک دیوار بناتے تھے اور پھر بھی پانی ادھر سے چلتا ہوا، کھیتوں میں سے ہو کر، ڈوبو مٹّی میں سے اور رُکھوں میں سے بہتا جھیل تک جاتا تھا اور اُسے پھر سے اُس کی ناک تک بھر دیتا تھا۔ اُن دنوں کھدائی اور بوائی بعد میں

کی جاتی تھی۔ پر اُس کی ہوش میں ایسا نہ ہوا تھا۔ اب تو دریا اتنا نیچے ہو گیا تھا کہ اِس کے کنارے ٹیلوں کی شکل میں خود ہی دیوار بن گئے تھے اور بڑا پانی آتا تو کھیتوں پر ایک دو پَوٹے مٹّی بچھا کر اُسی وقت اُلٹے پاؤں دریا کو لوٹتا جیسے اُس کی مدد کو واپس جاتا ہو۔

پاروشنی کے اُوپر پانی کے دو پرندے ہوا میں جیسے ٹھہرے ہوئے تھے۔ وُہ بھی جیسے بہاؤ کو سُنتے تھے پر وُہ تیز آواز میں بولتے جاتے تھے۔

ٹیلے سے پرے سروٹوں کی اوٹ میں سے دَھکڑ دَھکڑ کی سی آوازیں آنے لگیں اور ساتھ میں ماتی کے پُتروں کی خوشی کا شور مچاتی چیخیں اُس تک پہنچیں۔ وُہ زمین کھودنے کے بعد اپنی بیل گڈّ پر بستی کو لوٹ رہے تھے اور بے چارے بیلوں کو کُوٹ کُوٹ کر بھاگنے پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ عجیب بات ہے، پاروشنی نے ٹھنڈک سے بدن پر اُبھرتے روئیں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے سوچا، اگر بیل کا کوہان نہ ہو تو وُہ پوتر سمجھا جاتا ہے اور ساری حیاتی باڑے میں پڑا چین سے جُگالی کرتا ہے اور اگر اُس کا کوہان ہو تو بے چارے کو گڈّ میں جوت کر مارتے مارتے ادھ موا کر دیتے ہیں۔۔۔ دھکڑ دھکڑ کی آوازیں دُور ہو رہی تھیں اور ہولے ہولے دُور ہو گئیں۔ سروٹوں کے اُوپر دُھول اُٹھ رہی تھی۔ پاروشنی نے ایک بار پھر پانی کے بہاؤ پر اپنا کان لگایا اور اُدھر دیکھا جدھر سے جھاگ آیا کرتی تھی اور جدھر سے دریا کے بولنے کی آواز آنی چاہیئے تھی۔۔ بڑا پانی دیر سے آئے گا اور ہم اپنی زمینیں کھود چکے ہیں۔ یہ دریا کہاں سے آتا ہے؟ کدھر جاتا ہے؟ اور کب تک آتا رہے گا؟۔۔ اُس نے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا جو اُبھرے ہوئے ٹاپوؤں سے پَرے چند ٹیلوں اور لکیر کی شکل میں کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا اور اُس کے بدن میں جُھرجُھری سی آگئی۔ مور اور بیل تمہارے پنجر میں سے نکلنے والے سانس کو دوسرے کنارے پر پہنچاتے ہیں۔

رُکھوں والا مور پھر اُس کے ٹھٹھرتے جُثّے کے اندر جہاں ابھی سانس تھی بولا "می آؤں می آؤں"۔

بُوٹے کی جڑوں میں مٹّی کم ہو رہی تھی اور اُسے سانس لینے میں مُشکل پیش آ رہی تھی اور اُس کا وجود کپکپا رہا تھا اور مینہ موسلا دھار برستا جا رہا تھا۔ پتھروں کی اونچائیوں سے بھی اوپر برستے پانی کے ذرّے سفید دُھویں کی شکل میں پھیل رہے تھے اور نیچے بُوٹے، جھاڑیاں اور گھاس اپنے آپ کو ظاہر کر رہے تھے کہ اُن کے آس پاس اور بیچوں بیچ پانی بہہ رہا تھا۔ یہاں اِس اونچائی پر رُکھ نہ تھے جو پانی کی راہ میں روکاوٹ بنتے۔ وُہ کہیں نیچے تھے اور وہاں بھی مینہ برس رہا تھا۔ جہاں کہیں چٹانیں تھیں وہاں پانی ایک گہرے شور سے گر رہا تھا مگر جہاں پتّے اور گھاس تھی وہاں اُس کی آواز کُم ہوتی جاتی تھی۔ البتہ گرا ہوا پانی ایک ہلکی گونج کے ساتھ پتھروں اور ٹہنیوں کے بیچ پگڈنڈیاں بناتا بہہ رہا تھا۔ اور ہلکی نم پُرشور تاریکی تھی۔ نہ دن تھا اور نہ رات۔ بس مینہ تھا جو لگاتار گر رہا تھا اور کئی دن اور کئی رات سے مسلسل گر رہا تھا اور بُوٹے کی جڑوں میں مٹّی گُھلتی جاتی تھی۔ صرف اِس بُوٹے کو سانس لینے میں مُشکل پیش آ رہی تھی اور اِسی کا وجود کپکپا رہا تھا ورنہ اس کی نسل کے دوسرے بُوٹے اِس بے پناہ بوچھاڑ کو سہار رہے تھے کیونکہ وُہ سب اکٹھے ایک ہجوم میں تھے، قریب قریب، نچڑے ہوئے، اپنی جڑوں میں نمی محسوس کرتے ہوئے اور اپنے وجود کے ساتھ زور لگاتے، دھکیلتے پانیوں کو جُھک کر راہ دیتے ہوئے۔ وُہ سب محفوظ تھے کیونکہ ایک گروہ میں تھے اور اُن کے پاؤں کی مٹّی اگرچہ گیلی ہو رہی تھی لیکن اُس کے بہہ نکلنے کا امکان کم تھا۔ اور وہ جس کی جڑوں میں مٹّی بہہ نکلنے کو تھی جان بُوجھ کر اپنے گروہ سے الگ نہیں ہوا تھا۔ کوئی پرندہ تھا جو اِن اونچائیوں پر بھی آ گیا اور اُس کی بیٹ ایک بلند چٹان پر گری اور پتھروں کے بیچ ہواؤں نے تھوڑی سی مٹّی جمع کر دی تھی اور اُس مٹّی میں وُہ بیٹ گری اور اُس میں اُس کا بیج تھا جسے برفوں نے ڈھانکا اور وُہ زندہ رہا مگر سویا رہا اور پھر رُت بدلنے پر اپنی ہی گرمی سے برف پگھلا کر پھوٹا اور سرمور کی اُس چٹان پر دکھائی دینے لگا۔ اور شروع میں جب ہر پاسے تاریکی تھی اور تاریکی پانیوں پر تیرتی تھی تو کائناتی طاقت نے کہا کہ روشن ہو جا اور دیکھو وہاں روشنی تھی تو اُس

بُوٹے نے سب سے پہلے روشنی دیکھی جب کہ اُس کی نسل نیچے گہرائیوں میں تاریکی میں تھی۔ اور اب اُس کی جڑوں میں مٹّی کم ہو رہی تھی۔ چٹان پر گرتے سارے پانی کا بہاؤ اُس کی طرف تھا اور وہاں مٹّی بہت کم تھی اور گھل رہی تھی اور اُس کا وجود کُملا رہا تھا اور یکدم تاریکی پھر پانیوں پر تیرنے لگی۔ اُس کے پتّوں اور نچڑتی ہوئی ٹہنیوں نے پہلی بار اپنا ماتھا چٹان کی سختی پر گرتا ہوا محسوس کیا اور اس کے بعد جڑوں کے گرد صرف ہوا گردش میں تھی۔ بُوٹا گرا تو رکاوٹ ہوا اور بہتے پانی اُس کے بیچوں بیچ راستے بنانے لگے، پھر اُسے دھکیلنے لگے اور پھر اُس کا اختیار ختم ہوا اور وُہ برستے پانی کے بہاؤ کا ایک حصّہ بن کر اپنے گھر سے نیچے آنے لگا۔ اور اُس ہلکی پر شور تاریکی میں جو نہ دن تھا اور نہ رات اُس نے اپنے آپ کو ڈوبتے محسوس کیا اور پھر اُبھرتے اور پھر بے اختیار ہوتے اور نیچے ہی نیچے جاتے، پتھروں پر اٹکتے ہوئے نیچے اُترتے یا گرتے ہوئے۔ اور پانیوں کی پگڈنڈیاں اُس کے آسے پاسے رواں تھیں جو کبھی اُس راستے میں آگرتیں جس میں وُہ بہتا تھا اور کبھی اُس سے جُدا ہو کر دُور نکل جاتیں۔ ایک پہر کا سفر پُورا ہوا تو تاریکی ہلکی ہونے لگی مگر شور بڑھتا گیا۔ اور اِس شور میں کوئی بولتا تھا شائد وُہی جس نے کہا تھا کہ روشن ہو جا۔۔ وہ برف کی ایک سفید چٹان کے نیچے سے گزرا جو اُس کے راستے پر یُوں جُھکی تھی کہ ذرا اور جُھکتی تو راستہ روک لیتی۔

اگر یہ راستہ رُک جائے تو کیا ہو گا۔

دوسرے پہر تاریکی پھر گہری ہو گئی اور پانی گھنے رُکھوں کے سفید تنوں کے گرد لپٹتا ہوا بہہ رہا تھا۔ یہ رُکھ صرف اسی اونچائی پر ہوتے تھے اور ان کے تنے اور ٹہنیاں برف ایسے سفید تھے اور ان کے پتّے چھوٹے چھوٹے تھے۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر ان کا جنگل زندہ لگتا تھا اور پانی شور کرتا اس میں سے نیچے آتا تھا۔ اِن سفید رُکھوں کے آخر میں وُہ پہاڑوں سے ہمیشہ کے لئے الگ ہوا اور پانی کی دیوار میں چُنا ہوا ایک بڑی اونچائی سے نیچے ہوا میں گرنے لگا اور دیر تک گرتا چلا گیا۔ جب اُس کا ماتھا ایک بار پھر پتھروں سے ٹکرایا تو اُس کی کومل ٹہنیاں اور بہت سارے پتّے اُس سے الگ ہو کر کسی اور جانب بہہ گئے اور وُہ کُھرچی ہوئی شاخوں اور رگڑ کھائے ہوئے پتّوں سمیت ایک بڑی ندی کا حصّہ بن گیا۔

"سرسوتی، جو بڑے پانیوں کی ماں ہے اور ساتویں ندی ہے اُس کے
پانی آتے ہیں شاندار اور بُلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے۔۔"

مینہ ابھی رُکا نہیں تھا لیکن تاریکی چھٹ رہی تھی اور وُہ اُس ندی میں بے اختیار بہتا جا رہا تھا

جو اونچی چٹانوں سے سر ٹکراتی ایک آندھی کی طرح بہہ رہی تھی۔

"وہ اپنے زور سے کنول کے ڈنٹھل اکھیڑتی ہے اور اپنی طاقت والی لہروں سے پہاڑوں کے کنارے توڑتی ہے۔۔"

یہ بھی جانے کتنے پہروں کی مسافت تھی۔ اور پھر ایک پہر اُسے لگا کہ اُس کے نیچے پتھریلے گیٹوں کی بجائے ریت بچھ رہی ہے اور رگڑ کا شور کم ہو رہا ہے اور اب اُس کے وجود کو پانی دھکیل نہیں رہے بلکہ اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ تب اُس کی ایک شاخ پانی کی گہرائی میں سے ہلکی ہو کر اوپر بہاؤ میں سے اُبھری اور اُس کے چھلے ہوئے پتوں پر دُھوپ لشکی۔۔۔ اور دیکھو وہاں روشنی تھی اور اس میں پانی چمکتے تھے۔

"اور وہ ایک زور آور ندی ہے جو پوتر دماغوں کو اپنی روشنی سے روشن کرتی ہے۔۔۔"

اور اس روشنی میں پانیوں کے بہاؤ پر جھاگ پانیوں کے سفید پرندوں کی طرح تیر رہی تھی۔ اُن کے پیچھے وہ جگہیں جہاں سے وہ گزر آئے تھے وہاں سے پانیوں کے بولنے کی ہلکی آواز چلی آتی تھی۔ بُوٹے کے اکڑے ہوئے اور ٹھٹھرتے وجود پر پہلی بار نرم رُت کی ہوا چلی۔ پانی بھی تھکاوٹوں سے شرابور اپنے آپ کو ہموار کرتے ہوئے پھیلا رہے تھے اور پسار رہے تھے۔ یہاں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور یہ سفر کئی دن اور کئی رات کا تھا کیونکہ یہاں دن بھی تھا اور رات بھی تھی۔ سورج نکلتا تو مدھم گرماہٹ پانی میں اُترتی اور وہاں تک جاتی جہاں ٹھنڈک اُسے روک نہ دیتی۔ اندھیرا آتا تو ٹھنڈک اٹھتی اور پانی کے اوپر تک چلی جاتی اور وہاں رات ہوتی۔ یوں تو راستے میں بے انت دھارے اُس میں شامل ہو کر اُسے بڑا کرتے رہے لیکن ایک رات پانیوں کے بہنے کی آواز دوچند ہوئی۔ کوئی اور پانی تھے جو اگرچہ الگ تھے لیکن اُس کے قریب اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سو یہ تک وُہ ایسے ہی چلتے رہے اور پھر ایک مقام پر وہ آئے اور ایک دوسرے کے اندر تک چلے گئے اور بُوٹے کے تن کو پتہ چلتا رہا کہ یہاں ملاپ ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد وہ ایک بہت بڑی ندی کا حصّہ تھا جو میدانوں میں پھیل کر بہتی تھی۔ اُس کے کنارے بستیاں تھیں جن کے گھاٹ اُس کے سینے میں اُترتے تھے پر یہ لمبے فاصلوں کے بعد آتی تھیں۔ پھر کئی پہر کی مسافت ہوئی اور ایک بار پھر رُت بدلنے لگی، گرم ہونے لگی۔ ندی کے پانیوں میں ٹھنڈک کم ہوتی چلی گئی نیچے جہاں ریت تھی گرمی وہاں تک پہنچنے لگی اور پانی یوں بھی پہلے سے گھٹنے لگا کیونکہ سُوکھی فضا کے سانس اُسے چُوسنے لگے، سورج کی تپش اُڑانے لگی۔ بہاؤ پر بھاپ دھیرے